POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 October 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

ہفت روزہ
ہماری زبان
HAMARI ZABAN
(Weekly)
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 09-10-2026 • Price: 5/- • 15-21 October 2026 • Issue: 39 • Vol:85

۱۵تا۲۱/اکتوبر ۲۰۲۶ء • شمارہ:۳۹ • جلد:۸۵

قسط: 1

شبلی کی تحریکی حسیت اور اس کے اسباب و محرکات

محمد الیاس الاعظمی

علاّمہ شبلی نعمانی (1857-1914) اپنے عہد کے ایک بڑے بالغ نظر مفکر و مصلح اور دانش ور تھے۔ ان کا انداز ناصحانہ نہیں بلکہ عالمانہ اور دیدہ ورانہ تھا۔ وہ ملک وملت کے کسی بھی مسئلے یا کسی بھی پہلو پر پہلے غور وفکر کرتے، پھر اس کے بعد مقاصد اور حصول مقاصد کے طریقِ کار پر غور وخوض اور تحقیق وجستجو کے بعد ایک نقطہ نظر قائم کرتے، پھر اس کا ایک جامع منصوبہ وخاکہ تیار کرتے، آخر میں عملی تجاویز پیش کرتے اور احباب سے مشاورت کے لیے اکثر انھیں اخبارات میں شائع کرا دیتے۔ اس کے بعد اس کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تقریباً تمام علمی منصوبات وتحریکات اور اس کے مسائل و معاملات، مراسلات یا مضمون کی صورت میں پہلے اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے اور اہلِ نظر کو ان کے متعلق اظہارِ خیال کی دعوت بھی دیتے اور یہی سبب ہے کہ پیشِ نظر منصوبے یا خاکے کے متنوع پہلو اور نتائج سامنے آجاتے، اس کے بعد علامہ شبلی اس کام کی تکمیل کے لیے ہمہ تن مصروف ہوجاتے اور ہر ممکن اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ اس کی متعدد مثالیں آگے آرہی ہیں۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''اس مجموعہ (مقالات شبلی ہشتم) پر سرسری نظر ڈالنے سے مصنف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ساتھ نظر پڑ جاتی ہے، اشاعت اسلام، وقف اولاد، اوقاف اسلامی، تعطیل، نمازِ جمعہ، مجلسِ علمِ کلام، اشاعتِ کتب قدیمہ، ترجمہ انگریزی قرآن مجید، تالیف سیرتِ نبویؐ، وغیرہ مختلف قومی اور مذہبی تجویزیں انھوں نے قوم کے سامنے پیش کیں، ان میں سے کچھ کو اپنی کوششوں سے پورا کر دیا، کچھ ایسی تھیں جو مناسب فضا نہ ہونے سے بارآور نہیں ہوئیں۔''

(مقالاتِ شبلی، جلد ہشتم، ص:5)

ان تجویزوں اور منصوبوں کے علاوہ بھی انھوں نے بعض تجاویز پیش کیں اور انھیں تحریک کی شکل دینے کی کوشش کی، مثلاً دارالمصنّفین کا قیام وغیرہ۔ پیشِ نظر مقالے میں انھی کا ذکر وتعارف مقصود ہے۔

1. تحریک سرسیّد میں شمولیت

علامہ شبلی نعمانی تحصیل علم کے بعد اپنے خانوادے کے بزرگوں کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ مطالعے ومشاہدے کا شغل وہاں بھی جاری رہا اور مدینہ منورہ کے کتب خانوں سے خصوصی دلچسپی لی، واپس آکر مختلف مشاغل علمی وغیر علمی میں مصروف رہے۔ اسی زمانے میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں استاذ کی جگہ نکلی، اس کے امیدوار ہوئے۔ چناں چہ جنوری 1883 میں ان کا تقرر ہوا اور یکم فروری 1883 کو جوائن کیا اور تقریباً سولہ سال (اپریل 1898) تک وہاں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

علامہ شبلی نے نہایت دلچسپی اور انہماک سے تدریسی فریضہ انجام دیا اور طلبہ میں ادب وانشا اور شاعری کا ذوق پیدا کیا۔ اس دور کے ان کے بعض تلامذہ مثلاً مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، خوشی محمد خاں ناظر، مولوی مسعود علی محوی، حافظ ولایت اللہ، مولوی محفوظ علی بدایونی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق وغیرہ نے اپنی تحریروں میں اس کا نہایت شاندار لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ مولوی مسعود علی محوی نے لکھا ہے کہ وہ فارسی بالخصوص قصیدہ اس قدر عمدہ پڑھاتے تھے کہ بات دل ودماغ میں پیوست ہوجاتی تھی۔ مشہور فارسی قصیدہ گو قاآنی کو وہ اس قدر عمدہ انداز میں پڑھاتے تھے کہ طلبہ قاآنی کے انداز میں شعر کہنے لگے۔ خود محوی نے تاحیات قاآنی کا تتبع کیا۔ ان کا اردو وفارسی دیوان ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جو حیدرآباد سے شائع ہوچکا ہے۔

ایم اے او کالج علی گڑھ کے درس وتدریس کا یہ نہایت اہم باب ہے کہ اس کا آغاز قرآن مجید کے درس سے ہوا کرتا تھا اور یہ درسِ قرآن علامہ شبلی نعمانی مرحوم دیا کرتے تھے، اس میں تمام طلبہ کی شمولیت ضروری تھی۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر (علی برادران) اور سید سجاد حیدر یلدرم وغیرہ اسی درس قرآن کے شاگرد تھے، مولانا محمد علی جوہر نے لکھا ہے کہ 'میرا ذوقِ قرآن علامہ شبلی کے اسی درسِ قرآن کی دین ہے اور جو آج بھی قائم ہے'۔

ایم اے او کالج علی گڑھ کی خدمت تو ان کے فرائض میں شامل تھی مگر آہستہ آہستہ وہ تحریک سرسیّد یا علی گڑھ تحریک کا قوت وبازو بن گئے۔ اس سلسلے کی چند باتوں کا ذکر یہاں نہایت اختصار سے کیا جاتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ علامہ شبلی نے سرسیّد اور علی گڑھ کالج سے متاثر ہوکر اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کی بنیاد ڈالی اور اس کو علی گڑھ کالج ہی کی طرح کا ادارہ بنانا چاہا اور اس کے لیے انھوں نے گونا گوں کوششیں کیں۔ نیشنل اسکول کے قیام کے بارہ سال بعد 1899 میں جب نواب محسن الملک علامہ شبلی کی عیادت کے لیے اعظم گڑھ تشریف لائے اور شبلی منزل میں ٹھہرے تو نیشنل اسکول کے طلبہ نے انھیں سپاس نامہ پیش کیا۔ اس کے حرف حرف سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ نیشنل اسکول اعظم گڑھ ایم اے او کالج علی گڑھ کا ثانی تھا۔ اب تعلیمی اداروں کے اصول وضوابط بدل گئے اور زمانے کی ریت اور رواج بھی بدل گئے۔ نیشنل کالج اب شبلی نیشنل پی جی کالج ہے اور ایم اے او کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ باوجود اس کے دونوں اداروں کو ایک دوسرے سے وہی نسبت ہے جو شبلی کو سرسیّد سے تھی۔

نیشنل اسکول اعظم گڑھ سے مڈل، ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد اعلا تعلیم کے حصول کے لیے طلبہ عموماً اعظم گڑھ سے علی گڑھ کالج کا رخ کرتے تھے اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی نوع سے ہنوز قائم ہے۔

ایم اے او کالج علی گڑھ کے قیام وتعاون کے لیے ضلع اعظم گڑھ میں مولوی نذیر احمد دہلوی (1831-1912) نے 1874 میں ایک جلسے کا انعقاد کیا تھا اور اس میں سرسیّد احمد خاں (1817-1898) تشریف لائے تھے۔ اُس وقت علامہ شبلی زیرِ تعلیم تھے۔ روساے اعظم گڑھ بالخصوص علامہ شبلی کے والد اور ان کے ننھیال پھر یہاں کے ممتاز لوگوں نے اس جلسے میں شرکت کی اور اعانت بھی کی۔ اس کے بعد علامہ شبلی ایم اے او کالج علی گڑھ سے وابستہ ہوگئے تو وہاں جو بھی تقریب منعقد ہوتی اُس میں وہ شریک ہوتے، نظمیں اور قصائد پیش کرتے، غرض وہ علی گڑھ کالج کی ہر اس تقریب کا حصہ رہے جس سے کالج اور علی گڑھ تحریک کو فائدہ پہنچتا ہو۔ علامہ شبلی کے متعدد فارسی قصائد اسی دور کی یادگار ہیں۔

علی گڑھ سے وابستگی کے محض تین یا چار سال بعد علامہ شبلی نے تحریک علی گڑھ اور سرسیّد کی شان میں مثنوی 'صبح امید' لکھی جو اس قدر مقبول ہوئی کہ بقول شخصے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئی۔ اس کے بارے میں اردو کے ایک نامور ادیب نے لکھا ہے کہ 'اس میں شبلی نے سرسیّد کی ایسی سچی تصویر کھینچی ہے جو سرسیّد پر لکھی جانے والی بعض ضخیم نثری کتابوں سے بھی نہیں ہوسکی ہے'۔

علی گڑھ کالج یا تحریک علی گڑھ کو پروان چڑھانے کے لیے سرسیّد نے کئی اخبارات ورسائل نکالے۔ 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین' علی گڑھ کا اجرا بھی اسی سلسلے کی ان کی ایک کاوش ہے۔ پہلے وہ انگریزی میں نکلتا تھا، پھر اس کے اردو حصے کا اضافہ ہوا تو اس کا اڈیٹر علامہ شبلی کو بنایا گیا۔ یہ ذمے داری بھی انھوں نے بحسن وخوبی برسوں نبھائی۔ سرسیّد کی وفات سے کچھ پہلے اس کی ادارت سے سبکدوش ہوئے، لیکن چند

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

سالوں کی ادارت میں انھوں نے جو کچھ کر دکھایا وہ بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

چوں کہ علامہ شبلی ایم اے او کالج سے علاحدہ ہو گئے تھے اور تحریک میں شمولیت اختیار کر لی تھی، اس لیے سرسیّد تحریک کے بعض نام نہاد اہلِ قلم نے ان پر بے جا تنقیدیں کیں، اور بعض نے تنقیص بھی کی، اس کا ذکر تحریک ندوہ کے ضمن میں آگے آ رہا ہے۔

2۔ تحریک آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

سرسیّد مرحوم نے ہندستانی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے محض ایم اے او کالج ہی کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ بڑے پیمانے پر ہندستانی مسلمانوں کی اصلاحِ معاشرہ اور تعلیمی ترقی کے لیے 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' کی بھی بنیاد ڈالی، جس کے جلسے سال بہ سال ملک کے مختلف شہروں میں منعقد ہوتے اور نامورانِ تحریکِ علی گڑھ یا ان کے ہم نوا دلچسپی سے شریک ہوتے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اگرچہ اب مردہ ہو چکی ہے مگر آج تک قائم ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس 1886 میں سرسیّد نے قائم کی، اس کا پہلا اجلاس علی گڑھ کالج میں منعقد ہوا، جس میں علامہ شبلی شریک تھے۔ اس کی پہلی قرارداد بھی علامہ شبلی ہی نے پیش کی اور اس کے مختلف اجلاسوں میں شریک رہے اور بحث و مباحثے میں بھی حصہ لیا۔ سرسیّد کی وفات کے بعد بھی علامہ شبلی اس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے، اس کے تعلیمی مباحث میں حصہ لیتے، تقریریں کرتے، قراردادیں پیش کرتے اور قراردادوں کی تائید و مخالفت بھی کرتے۔ گویا اس میں دل و جان سے شریک ہوتے رہے۔ اس کی تفصیلات ناچیز نے اپنی کتاب 'مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ' میں قلم بند کی ہے، جسے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ نے 2021 میں شائع کیا ہے۔

یہ تحریک سرسیّد کی قائم کردہ تھی مگر علامہ شبلی نے اپنی تحریکوں ہی کی طرح اس میں حصہ لیا اور اس کے پروان چڑھانے میں پوری دلچسپی لی بلکہ اس کے قیام کے بعد سرسیّد اس سے کسی قدر متنفر ہو گئے تھے۔ ایک اجلاس میں اسے وقت اور پیسے کا ضیاع قرار دیا اور اسے ختم کر دینے کی تجویز پیش کی مگر اس موقعے پر علامہ شبلی نے ان کی مخالفت میں جو بلیغ تقریر کی اس سے متاثر ہو کر سرسیّد نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور پھر اسی شان سے کانفرنس کام کرتی رہی۔ علامہ شبلی آخری بار کانفرنس کے سالانہ اجلاس 1913 میں شریک ہوئے۔ 1914 کے اجلاس کے انعقاد سے پہلے وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ۔

سالانہ اجلاسوں میں ملک کی کسی مقتدر شخصیت سے اجلاس کی صدارت کرائی جاتی تھی اور وہ صدارتی خطبہ پیش کرتا تھا، جو عموماً اجلاس کی جان ہوا کرتا تھا۔ ان خطبات کا مجموعہ ایجوکیشنل کانفرنس نے شائع کیا ہے۔ ان کا مطالعہ و تجزیہ گذشتہ ہندستان کے مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تعجب ہے کانفرنس کے ایک بڑے شیدائی علامہ شبلی کو صدارت کا موقع نہیں دیا گیا۔

3۔ انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت

1883 میں علامہ شبلی ایم اے او کالج علی گڑھ سے وابستہ ہوئے، اس کے دو ڈھائی سال بعد 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ان کی تحریک نہ تھی اور نہ اس سے براہ راست وہ وابستہ رہے۔ سرسیّد احمد خاں نے اسے مسلمانوں کے لیے ناپسند کیا بلکہ مسلمانوں کے لیے اسے مضر قرار دیا مگر علامہ شبلی نے ان کی رائے کے برعکس مسلمانوں کے لیے کانگریس کو پسند کیا اور اس کی حمایت کی اور ہمیشہ اس کے ہمدرد و بہی خواہ رہے۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ میں 16 برس سرسیّد کے ساتھ رہا، لیکن ان کے سیاسی نظریے کا مخالف رہا اور کانگریس کی حمایت کی اور اسے مسلمانوں کے لیے دل سے پسند کرتا رہا۔

اکابرِ ہندستان میں علامہ شبلی ہندو مسلم اتحاد کے ایک بڑے حامی و ہمدرد اور داعی تھے اور اس پر مسلسل زور دیتے رہے اور آخر تک ان کے اس نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس موضوع پر ان کا شاندار مقالہ آج بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

علامہ شبلی اگرچہ کانگریس کے حامی رہے اور اسے دل سے پسند کرتے رہے اور اس وقت کی کانگریس کے نظریات سے پوری طرح اتفاق رکھتے تھے اور اپنے نظریات اپنے لوگوں بالخصوص اپنے تلامذہ میں پھیلاتے رہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ ہندوستان کے پہلے نیشنلسٹ مسلمان قرار پائے اور ان کے تلامذہ و منتسبین نے بھی اسی نقطۂ نظر پر ہندستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کی۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، خوشی محمد خاں ناظر، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا سیاسیات میں وہی نظریہ تھا جو ان کے استاد علامہ شبلی کا تھا۔ بحیثیت مجموعی اب تک اس موضوع کا مفصل مطالعہ و جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے، لیکن اگر علمی و تحقیقی جائزہ لیا جائے تو جدید اور آزاد ہندستان میں علامہ شبلی اور تلامذہ و منتسبین شبلی کا حصہ غالباً بہت نمایاں ہو کر سامنے آئے گا۔ ان کے ایک شاگرد سیّد طفیل احمد منگلوری (1868-1946) نے لکھا ہے:

> ''عجیب بات ہے کہ جب سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست سے نکل کر عام ملکی سیاست میں داخل ہوئے قدیم تعلیم یافتگان کا حصہ اس میں نمایاں ہو گیا بلکہ انھوں نے مسلمانوں کو فرقہ پرستی کے دلدل سے نکالنے میں خاص کام کیا جس میں سب سے اول مولانا شبلی تھے۔''
>
> (مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص:377)

4۔ مجلس موازنہ ترقی قوم

جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

> ''(اعظم گڑھ میں) برادری کے لوگوں کی سالانہ ترقی کی جانچ کے لیے 'موازنہ ترقی قومی' کے نام سے ایک مجلس کی بنیاد ڈالی، جس کی طرف سے ہر سال برادری کی تعلیمی ترقی کی روداد مرتب ہوتی اور لوگوں میں تقسیم ہوتی ہے، مولانا کے مکاتیب میں اس موازنہ قومی کا ذکر بار بار آیا ہے۔''
>
> (حیاتِ شبلی، ص:184)

یہ دراصل محدود پیمانے پر یعنی اعظم گڑھ کی حد تک اصلاح معاشرہ اور تعلیمی تحریک تھی، اس کے سکریٹری مولوی محمد سمیع موضع بینا پارہ تھے، جنھیں علامہ شبلی اور ان کے کاموں سے بے پناہ عقیدت تھی، البتہ انھوں نے اس مجلس موازنہ ترقی قومی کی جو رودادیں شائع کیں، اس کا ایک نسخہ بھی اب تک تلاشِ بسیار کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں بچوں کا جو کتب خانہ 'الاصلاح' کے نام سے قائم ہے، اس میں ہونے کا بڑی حد تک امکان ہے مگر راقم کی وہاں تک رسائی نہ ہو سکی، اس کی رودادیں مل جاتیں تو اس مجلس کی تفصیلات اور خدمات منظرِ عام پر آ جاتیں اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ عہدِ شبلی میں اعظم گڑھ کے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی تاریخ کیا ہے۔

5- تحریک نامور فرماں روایان اسلام

علامہ شبلی علی گڑھ کالج میں سرسیّد اور پروفیسر آرنلڈ وغیرہ کی صحبت میں جب یورپ کی تاریخی تحقیقات سے واقف ہوئے تو ان کو معلوم ہوا کہ مورخین یورپ خاص طور سے مستشرقین نے اسلام، شارعِ اسلام، اسلامی علوم و اقدار و روایات اور مسلمان حکمرانوں پر شدید تنقید بلکہ تنقیص کی ہے اور اسلام کی شبیہ خراب کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ چناں چہ علامہ شبلی نے ان کے رد و ابطال کا ایک جامع منصوبہ بنایا، جس کے تحت اسلامی حکومتوں کی نہایت مفصل اور بسیط تاریخ لکھنا ان کی اولین ترجیح قرار پایا، مگر منصوبے کی طوالت کے پیشِ نظر اسے مختصر کر کے تاریخِ بنوعباس لکھنے پر اکتفا کرنا چاہا مگر یہ کام بھی طویل نظر آیا تو اسے اور مختصر کر کے صرف نامور فرماں روایان اسلام تک محدود کر دیا اور ہر طبقے سے محض ایک ایک نام ور کا انتخاب کیا۔

علامہ شبلی جن نامور فرماں روایان اسلام کے حالات اور کارنامے قلم بند کرنا چاہتے تھے ان کے نام یہ ہیں: خلفائے راشدین میں حضرت عمر فاروقؓ، بنوامیہ میں ولید بن عبدالملک، بنوعباس میں مامون الرشید، اندلسی بنوامیہ میں عبدالرحمٰن ناصر، بنوحمدان میں سیف الدولہ، سلجوقیوں میں ملک شاہ، نوریہ میں نورالدین زنگی، ایوبیہ میں صلاح الدین ایوبی، موحدین اندلس میں یعقوب بن یوسف اور ترکانِ روم میں سلیمان اعظم۔

(المامون، ص9-8، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ 1992)

ان ناموروں میں علامہ شبلی نے اپنے منصوبے کے مطابق 'المامون' اور 'الفاروق' دو معرکہ آرا کتابیں لکھیں اور نہایت ہی بلند رتبہ اور محققانہ کتابیں سپردِ قلم کیں، لیکن دوسرے ناموروں پر وہ اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے قلم نہ اٹھا سکے اور پھر کسی اور نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں دی، حتیٰ کہ ان کے تلامذہ اور منتسبین نے بھی درخورِ اعتنا نہ کیا۔ دارالمصنّفین کے قیام و استحکام کے بعد بھی اس سلسلے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی، اردو کے دوسرے اہلِ قلم نے ان ناموروں پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ علامہ شبلی کے بلند معیار و مذاق کے مقابلے میں کم تر درجے کی ہیں، یقیناً شبلی کے بلند معیار و منہج پر اگر یہ کام ہو گیا ہوتا تو ہمارے سرمایۂ ادب میں نہایت گراں قدر اضافہ ہوا ہوتا اور مسلمان حکمرانوں کے صحیح اور شاندار کارناموں سے بچہ بچہ واقف ہوتا۔ نیز معاشرے اور اس کی فکری سطح بھی بلند ہوئی ہوتی۔

حکومت و سلطنت کے ان مشاہیر کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی علومِ اسلامیہ کے بے تاج بادشاہوں اور اصل فرماں روایانِ مملکت علم و دانش کے حالات و سوانح بھی قلم بند کرنا چاہتے تھے، وہ لکھتے ہیں:

> ''اول اول جب مجھ کو اس (نامور فرماں روایان اسلام) کا خیال پیدا ہوا تھا تو نہایت وسیع بنیاد پر ہوا، جس طرح میں نے خلافت و سلطنت کے مختلف خاندانوں سے ہیروز انتخاب کیے تھے، ارادہ تھا کہ اسی طرح علوم و فنون کے جدا جدا خاندان قائم کیے جائیں اور جو لوگ ان خاص خاص فنون میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، ان کو اس سلسلے کا ہیرو قرار دیا جائے مگر اتنا بڑا کام تنہا میرے بس کا نہ تھا، مجبوراً حیثیت حکومت کی قید لگا کر میں نے اس خیال کو بہت کچھ محدود کر دیا بلکہ اس سلسلۂ حکومت سے بہت سے خاندان چھوڑ دیے تاہم وہ خیال دل سے نہ گیا کہ فرصت ہو تو اہلِ کمال کا دربار بھی سجایا جائے کہ السیف والقلم توامان''۔
>
> (سیرۃ النعمان، دیباچہ، ص:7)

چناں چہ علامہ شبلی نے ان بے تاج بادشاہوں میں امام ابوحنیفہؒ (سیرۃ النعمان)، امام غزالی (الغزالی) اور مولانا رومؒ (سوانح مولانا روم) پر معرکہ آرا کتابیں قلم بند کیں۔ علامہ ابنِ تیمیہ اور ابنِ رشد پر مختصر مگر جامع مضامین سپردِ قلم کیے اور وہ مزید اس سلسلے کو آگے نہ بڑھا سکے، بعد میں ان کے تلامذہ نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا، مثلاً امام رازی، ابنِ خلدون، سیرتِ عمر بن عبدالعزیز (مولانا عبدالسلام ندوی)، سیرتِ عائشہؓ، حیاتِ امام مالک، خیام (مولانا سید سلیمان ندوی)، ابنِ رشد (مولانا محمد یونس انصاری فرنگی محلی)، ابنِ تیمیہ (مولانا محمد یوسف کوکن عمری) وغیرہ دارالمصنّفین کی مایۂ ناز کتابیں دراصل اسی سلسلے کی مطبوعات ہیں، اس کو مزید بڑھایا جا سکتا تھا، تاہم دارالمصنّفین نے اپنی بساط بھر اس کام کو انجام دیا، البتہ ملک کے دوسرے اہلِ قلم نے اس سلسلے کو شعوری طور پر آگے بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی، یقیناً اس سلسلے کی تکمیل سے ہمارے ذخیرۂ علمی میں گراں قدر اضافہ ہوتا اور علامہ شبلی کے فکر و خیال کی ترویج میں بھی اس سے مدد ملتی اور ان کتابوں سے اسلاف کے شاندار ماضی سے یقیناً ملت کے طور طریقے اور طرز معاشرت میں ایک انقلاب برپا ہوا ہوتا۔

ناچیز نے اپنے ایک مضمون (عہدِ حاضر میں علامہ شبلی کی تجویزوں اور منصوبوں کی معنویت) میں اربابِ دارالمصنّفین کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو اس کے جواب میں مولانا ضیاء الدین ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

دو عظیم شخصیتیں اور کرب ایک

مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح

محمد مسلم کبیر

تاریخ کبھی کبھی ایسے کردار پیدا کرتی ہے جنھیں سمجھنے کے لیے صرف تاریخ کی کتابیں کافی نہیں ہوتیں۔ان کے لیے انسان کو سیاست سے نکل کر انسانیت کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح بھی برِّصغیر کی تاریخ کے ایسے ہی دو کردار ہیں۔ دو الگ مزاج، دو الگ سیاسی راستے، دو مختلف تصوراتِ ہندستان اور دو مختلف منزلیں،مگر ایک ہی عہد، ایک ہی غلام ملک اور ایک ہی سامراجی اقتدار کے خلاف طویل جدوجہد۔

ایک طرف مہاتما گاندھی تھے، جنھوں نے عدم تشدد، ستیہ گرہ اور ہندو مسلم اتحاد کو اپنی سیاست کا مرکز بنایا۔ دوسری طرف محمد علی جناح تھے، جو ابتدا میں ہندو مسلم اتحاد کے داعی اور آئینی سیاست کے علمبردار رہے، لیکن وقت کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے سوال کو اپنی سیاست کا بنیادی محور بناتے گئے۔ پھر تاریخ نے دونوں کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جہاں راستے الگ ہوگئے، منزلیں جدا ہوگئیں اور بالآخر ہندستان تقسیم ہوگیا۔

آزادی آئی ضرور، مگر اپنے ساتھ ہجرت کا قافلہ، خون کے دھبے، اجڑے ہوئے گھر اور بچھڑے ہوئے خاندان بھی لے آئی۔ یہ کیسی آزادی تھی؟ جن لوگوں نے آزادی کا خواب دیکھا تھا، ان میں سے لاکھوں نے آزادی کی صبح اپنے گھروں میں نہیں بلکہ ریلوے کے ڈبوں، مہاجر کیمپوں اور اجنبی شہروں میں دیکھی۔

آزادی کا جشن اور تقسیم کا ماتم:

15 اگست 1947 کو برِّصغیر آزاد ہوا۔ ایک طرف جشن تھا، پرچم تھے، تقریریں تھیں، آزادی کے نعرے تھے؛ دوسری طرف انسان اپنے گھروں سے بے گھر ہو رہے تھے۔ تاریخ کا یہ کیسا مذاق تھا کہ جس آزادی کے لیے برسوں جدوجہد ہوئی، اسی آزادی کے وقت انسان کو اپنے ہی پڑوسی سے خوف محسوس ہونے لگا۔ مذہب، جو انسان کو انسان سے جوڑنے کا ذریعہ بن سکتا تھا، سیاست کے ہاتھوں شناخت کی دیوار بن گیا، اور پھر وہ ہوا جسے آج بھی یاد کرتے ہوئے دل کانپ اٹھتا ہے۔ ہجرت ہوئی، قتل ہوئے، خاندان بچھڑے، عورتیں بیوہ ہوئیں، بچے یتیم ہوئے اور لاکھوں انسان اپنے آبائی گھروں کو آخری بار دیکھ کر نکل گئے۔ نقشے پر صرف ایک لکیر کھینچی گئی تھی، مگر اس لکیر نے انسانوں کے سینوں پر ایسی لکیریں کھینچ دیں جنھیں سات دہائیاں بھی مٹا نہ سکیں۔

گاندھی جی نے آزادی دیکھی مگر سکون نہ دیکھا:

گاندھی جی ہندستان کی آزادی کے سب سے بڑے عوامی رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں، مگر آزادی کا وہ لمحہ، جس کا خواب انھوں نے برسوں دیکھا تھا، ان کے لیے مکمل مسرت کا لمحہ ثابت نہ ہوا۔ ملک آزاد ہوگیا تھا، لیکن ہندستان بٹ چکا تھا۔ وہ فرقہ وارانہ تشدد کے درمیان امن قائم کرنے کے لیے سرگرم رہے۔ جب دہلی میں نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی تو گاندھی اقتدار کے جشن میں نہیں بلکہ متاثرین کے درمیان نظر آئے۔

تاریخ کا سب سے بڑا طنز ھے:

جس شخص نے اپنی سیاست میں عدم تشدد کو اتنی اہمیت دی، لیکن اس کی زندگی کا اختتام تشدد کی گولی سے ہوا۔ آزادی کے صرف چند ماہ بعد 30 جنوری 1948 کو گاندھی جی کو شہید کر دیا گیا۔ گاندھی جی کو ناتھو رام گوڈسے نے گولی مار کر شہید کیا۔ گوڈسے اپنے قومی نظریات سے متاثر تھا اور مہاتما گاندھی کو مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت، ہندو مسلم اتحاد اور تقسیم کے بعد مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے پر سخت تنقید کا نشانہ بناتا تھا۔ اس کے نزدیک گاندھی کی پالیسیوں نے اکثریتی طبقے کے مفادات کو نقصان پہنچایا تھا، حالاں کہ گاندھی جی مسلسل مذہبی منافرت کے خلاف کھڑے رہے اور ہر انسان کے مساوی حقوق کی بات کرتے رہے۔ گویا تاریخ نے کہا ہو کہ جس شخص نے دوسروں کو نفرت چھوڑنے کا درس دیا، اسے بھی نفرت کی گولی سے نہیں بخشا جائے گا۔

محمد علی جناح خواب پورا ھوا، مگر مہلت نہ ملی:

پاکستان کا مطالبہ ایک نئی مملکت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک خواب حقیقت بن چکا تھا، لیکن خواب کی تعبیر دیکھنے والے کے پاس اسے سنوارنے کے لیے وقت بہت کم تھا۔ 14 اگست 1947 کو پاکستان وجود میں آیا اور جناح نئی ریاست کے پہلے گورنر جنرل بنے، مگر قیامِ پاکستان کے صرف ایک سال بعد 11 ستمبر 1948 کو وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ایک نئی ریاست ابھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونا سیکھ ہی رہی تھی کہ اس کا بانی اس دنیا میں نہیں رہا۔ محمد علی جناح کے آخری دن بیماری، کمزوری اور شدید جسمانی تکلیف میں گزرے۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت ان کی بگڑتی ہوئی صحت اور علاج کی ضرورت کے معاملے میں وہ توجہ نہ دے سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ انھیں کوئٹہ اور پھر کراچی منتقل کرنے کے لیے جو سرکاری انتظام کیا گیا، وہ انتہائی ناقص ثابت ہوا۔ کراچی پہنچنے کے بعد ایمبولینس کا راستے میں خراب ہو جانا اور بانیِ پاکستان کو طویل وقت تک بے یار و مددگار رہنا حکومت کی لاپروائی اور انتظامی بے حسی کی دردناک مثال بن گیا۔ ایک ایسی ریاست جس کے قیام کے لیے جناح نے اپنی زندگی وقف کر دی، وہ اپنے آخری لمحوں میں انھیں مناسب طبی سہولت اور باوقار سفر بھی فراہم نہ کر سکی۔

تاریخ کا عجیب مذاق :

ایک رہنما نے متحدہ ہندستان کا خواب دیکھا، مگر ملک تقسیم ہوگیا۔ دوسرے نے مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کیا، وطن حاصل ہوا، مگر بانی کو اسے سنوارنے کے لیے چند ہی ماہ مل سکے۔ دونوں قائدین کو اپنے آزاد ملکوں میں، آزاد اور پرسکون زندگی کی سانسیں لینے، اپنے مقاصد کی تکمیل کے مراحل کو دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔

سیاست کی بڑی عمارتیں اور گھروں کے چھوٹے دکھ :

ہم اکثر بڑے رہنماؤں کو اتنا بڑا بنا دیتے ہیں کہ وہ ہمیں انسان نظر آنا بند ہو جاتے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ گاندھی بھی ایک باپ تھے اور جناح بھی۔ گاندھی جی کے چار بیٹے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے ہری لال گاندھی کی زندگی اپنے والد کے ساتھ پیچیدہ تعلقات اور ذاتی مشکلات سے گزری۔ ہری لال نے مذہب تبدیل کیا، پھر دوبارہ اپنے سابق مذہبی دائرے میں واپس آئے، اور ان کی زندگی شراب نوشی، مالی پریشانیوں اور خاندانی کشمکش سے دوچار رہی۔ گاندھی جی اپنے بیٹے کی حالت سے گہرا دکھ محسوس کرتے تھے، مگر باپ ہونے کے باوجود وہ اس کی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق سنوار نہ سکے۔ گاندھی جی کے قتل کے چند ماہ بعد ہری لال بھی 18 جون 1948 کو دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ایک باپ جسے دنیا 'مہاتما' کہتی تھی، اپنے گھر کے ایک بڑے انسانی المیے کو بھی اپنے ساتھ لیے پھرتا رہا۔

ادھر محمد علی جناح کی اکلوتی اولاد دینا جناح تھیں۔ ان کی زندگی نے بھی تاریخ کے کئی موڑ دیکھے۔ ان کی شادی نیول واڈیا سے ہوئی اور وہ تقسیم کے بعد ہندستان میں رہیں۔ والد اور بیٹی کے درمیان تعلقات میں ذاتی اختلافات کے باوجود یہ رشتہ تاریخ کے صفحات پر اپنی جگہ رکھتا ہے۔ دینا کی شادی محمد علی جناح کی خواہش کے مطابق نہیں ہوئی تھی، جس کے باعث باپ اور بیٹی کے درمیان ایک عرصے تک فاصلے رہے۔ یہ اختلاف محمد علی جناح کے لیے یقیناً ایک ذاتی دکھ تھا، اگرچہ انھوں نے اپنی نجی زندگی کے اس پہلو کو عوامی سیاست سے الگ رکھا۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کے لیے ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھ رہے تھے، دوسری طرف اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ تعلق میں پیدا ہونے والی دوری کا درد بھی اپنے دل میں لیے ہوئے تھے۔ دینا واڈیا نے اپنے والد کی وفات کے برسوں بعد پاکستان کا سفر کیا اور ان کے مزار پر حاضری دی۔ سوچنے کی بات ہے، جس شخص نے ایک نئی مملکت کے قیام کے لیے سیاست کی پوری بساط بدل دی، اس کی اپنی بیٹی کی زندگی بھی دو ملکوں کے درمیان ایک خاموش تاریخی پل بن گئی۔

دو خاندان، دو المیے ، ایک تاریخ:

گاندھی جی اور محمد علی جناح کی سیاسی زندگیوں کا موازنہ کرنے والے بہت مل جائیں گے۔ کوئی مہاتما گاندھی جی کے نظریات کی تعریف کرے گا، کوئی محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت کو نمایاں کرے گا۔ کوئی تقسیم کو تاریخی ضرورت قرار دے گا اور کوئی اسے برصغیر کا عظیم المیہ سمجھے گا، مگر ایک سوال ان سب بحثوں سے بڑا ہے: کیا تاریخ کے بڑے فیصلوں کا بوجھ صرف سیاست داں اٹھاتے ہیں؟ نہیں...! اس کا بوجھ عام انسان بھی اٹھاتا ہے۔ وہ کسان بھی جو اپنی زمین چھوڑ کر گیا۔ وہ عورت بھی جو اپنے گھر سے بے گھر ہوئی۔ وہ بچہ بھی جس نے راستے میں اپنے والدین کو کھو دیا۔ وہ خاندان بھی جس کی نسلوں کی یادیں سرحد کے دوسری طرف رہ گئیں —— اور وہ اولاد بھی جو اپنے عظیم باپ کے نام کے سایے میں اپنی الگ زندگی تلاش کرتی رہی، کبھی باپ کی توقعات، کبھی اختلافات اور کبھی عوامی شہرت کے بوجھ تلے دبتی رہی۔ گاندھی جی کے گھر کا دکھ ہری لال کی صورت میں سامنے آیا، جو اپنے والد کی عظمت کے باوجود اپنی زندگی کے بحرانوں سے نہ نکل سکے۔ محمد علی جناح کے گھر کا دکھ دینا کی صورت میں دکھائی دیا، جو اپنے والد سے محبت کے باوجود ان سے پیدا ہونے والی دوری اور دو ملکوں کے درمیان بٹی ہوئی شناخت کے ساتھ زندگی گزارتی رہیں۔

موت نے دونوں کے درمیان آخری فاصلہ بھی مٹا دیا:

گاندھی جی اور محمد علی جناح زندگی بھر سیاسی اختلافات کے مختلف راستوں پر چلتے رہے، لیکن موت نے دونوں کو ایک ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

اردو دُنیا

اردو میٹھی و پیاری زبان اور دلوں کو جوڑنے کا بہترین ذریعہ بھی ہے: وی. ہنمنت راؤ

حیدرآباد(2اکتوبر)۔انجمن محبانِ اردو تلنگانہ کے رویندرا بھارتی میں منعقد ہوئے عظیم الشان عالمی مشاعرے نے تاریخ رقم کی۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی مقامی و بیرونی اور عالمی شعرا نے اپنے کلام اور بیان کے ذریعے اردو والوں کے دلوں پر زبردست نقوش چھوڑے۔ جناب وی ہنمنت راؤ مشیر بی سی ویلفیئر اینڈ ڈیولپمنٹ حکومت تلنگانہ نے کہا کہ حیدرآباد گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار ہے۔ انجمن محبانِ اردو تلنگانہ کے روحِ رواں جناب سیّد مسکین احمد اردو مشاعروں کے ذریعے اردو کی عظیم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اردو زبان بڑی میٹھی اور پیاری زبان ہے، یہ زبان دلوں کو جوڑنے کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے انجمن محبانِ اردو تلنگانہ کی جانب سے اندرا گاندھی یادگار عالمی امن مشاعرہ بہ عنوان 'قیامِ امن' سے خطاب کرتے ہوئے رویندرا بھارتی تھیٹر حیدرآباد میں کیا۔ تقریب کا آغاز مہمانوں نے شمع روشن کرتے ہوئے کیا۔ ہنمنت راؤ نے کہا کہ انجمن محبانِ اردو تلنگانہ کی جانب سے شہر حیدرآباد اور اضلاع کے علاوہ دیگر مقامات پر جو مشاعرے ہوتے ہیں، اُس سے قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ تہذیبی سفیر جناب افتخار شریف نے کہا کہ امریکہ میں اردو کی نئی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں، امریکہ میں اردو بہت زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، مشاعروں سے عوام کی دلچسپی قابلِ دید ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حال ہی میں امریکہ میں مَیں نے ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں عمران پرتاپ گڑھی کو مدعو کیا گیا تھا۔ عمران پرتاپ گڑھی کے کلام سے عوام بہت ہی لطف اندوز ہوئے۔ انھوں نے رویندرا بھارتی کے مشاعرے میں ماسکو کی شاعرہ کی اردو شاعری پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کے لیے جناب مسکین احمد قابلِ مبارک باد ہیں، وہ ریاستی اور قومی سطح کے علاوہ عالمی سطح کے شعرا کو مدعو کرتے ہوئے اردو شائقین کی تشنگی دور کر رہے ہیں۔ مزاحیہ شاعر جناب لطیف الدین لطیف نے پروگرام کی نظامت کی جب کہ مشاعرے کی نظامت استادِ سخن ڈاکٹر سردار سلیم نے نہایت باوقار انداز میں کی۔ ابتدا میں جناب لطیف الدین لطیف نے انجمن محبانِ اردو تلنگانہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے 48 سال سے انجمن محبانِ اردو تلنگانہ کے زیرِ اہتمام مشاعرے منعقد ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں مسکین احمد کے جذبے و حوصلوں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ جناب سیّد مسکین احمد (نگراں مشاعرہ و صدر انجمن محبانِ اردو تلنگانہ) نے کہا کہ انجمن کی طرف سے فروغِ اردو کے لیے بڑے پیمانے پر داغؔ دہلوی مشاعرہ اور دیگر مشاعرے منعقد ہوتے ہیں جس میں اردو عوام کی بڑی تعداد شریک ہوتی ہے۔ اس پروگرام میں دیگر مہمانان میں پروفیسر ایس اے شکور نے کہا کہ اردو مشاعرے ہماری تہذیبی روایت ہیں۔ جناب مسکین احمد مشاعروں کے ذریعے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں جو لائقِ ستائش ہے۔

(رہنمائے دکن۔حیدرآباد)

انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیرِ اہتمام راہی معصوم رضا صدی تقریبات کی تیسری پیش کش

ٹوپی شکلا ناول پر مبنی 'ٹوپی کی داستان' نے شائقین سے خوب داد و تحسین حاصل کی

نئی دہلی۔انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام 27 ستمبر 2026 کو شام 6 بجے راہی معصوم رضا صدی تقریبات کے تیسرے پروگرام کا انعقاد سیّدنا سیف الدین اوڈیٹوریم، اردو گھر میں کیا گیا، جس میں راہی معصوم رضا کے مشہور ناول 'ٹوپی شکلا' پر مبنی 'ٹوپی کی داستان' کو ڈرامائی شکل میں پیش کیا گیا۔ 'ٹوپی شکلا' کی داستان کے کرداروں کو محترمہ وندنا ڈوگرا، جناب طارق حمید، جناب آیوش شرما اور جناب سوریہ پرتاپ سنگھ (ونگز کلچرل سوسائٹی) نے بہ خوبی اپنے منفرد اور دل میں گھر کر جانے والے انداز میں پیش کیا۔

'ٹوپی شکلا' دراصل راہی معصوم رضا کا ایسا ناول ہے جو اپنے کرداروں کے ذریعے ایک طرف تو مذہب کی دیواروں پر گفتگو کرتا ہے اور دوسری جانب اس کے کردار الگ الگ مذاہب کے ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اس میں ہندو مسلم تعلقات، فرقہ وارانہ منافرت، تنہائی اور معاشرتی منافقت پر بحث کی گئی ہے۔

ٹوپی ایک ایسے برہمن خانوادے سے تعلق رکھتا ہے جو ظاہری طور پر مذہبی اور روایتی ہے مگر اندرونی طور پر تعصب اور کھوکھلے پن کا شکار ہے۔ ٹوپی کے اہلِ خانہ سے اسے وہ اپنائیت اور محبت نہیں ملتی جس کا وہ طلب گار رہتا ہے۔

ٹوپی کی گہری دوستی ایک مسلم لڑکے سیّد ضرغام مرتضیٰ سے ہوتی ہے، جسے پیار سے سب عفّن کہتے ہیں۔ یہاں ٹوپی کو اپنے اہلِ خانہ سے زیادہ پیار اور محبت ملتی ہے۔ جب عفّن کا خاندان پاکستان ہجرت کر جاتا ہے تو ٹوپی شدید تنہائی کا شکار اور بے حد جذباتی ہو جاتا ہے۔

راہی نے اس ناول کے ذریعے ہندستانی معاشرت کے ایک بے حد تاریک پہلو کو اجاگر کیا ہے، جہاں انسانی رشتوں اور محبت کو مذہب اور ذات پات کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ راہی کے بقول پورا ناول معاشرے کے لیے ایک سخت چوٹ جیسا ہے۔

ٹوپی کی داستان کے تمام فن کاروں نے بہترین اور منجھے ہوئے انداز میں اپنے کردار پیش کیے اور شائقین سے داد و تحسین حاصل کی۔

اس موقعے پر انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تمام فن کاروں کی تعریف کی اور ان کے فن کو سراہا، اور اس خوب صورت پروگرام کو ترتیب دینے پر جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی کو مبارک باد پیش کی اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح اپنی سرگرمی کا مظاہرہ کرتے رہیں گے۔ اس پروگرام کی نظامت کے فرائض سالم فاروق ندوی صاحب نے بہ حسن و خوبی انجام دیے اور آخر میں پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا۔

2026 کا نوبل انعام برائے ادب کنیڈین شاعرہ این کارسن کے نام

سویڈش اکیڈمی نے کلاسکی روایت سے تخلیقی مکالمے اور جدید ادب کے لیے نئی صورتیں تشکیل دینے پر 76 سالہ مصنفہ کو عالمی اعزاز سے نوازا

کنیڈین شاعرہ، مضمون نگار اور کلاسکی ادب کی ماہر این کارسن نے 2026 کا نوبل انعام برائے ادب جیت لیا ہے۔ سویڈش اکیڈمی نے جمعرات 8 اکتوبر کو اعلان کیا کہ انھیں 'کلاسکی روایت کے ساتھ کھیلتے ہوئے مکالمے میں جدید ادب کے لیے نئی صورتیں تخلیق کرنے والے ان کے جرأت مند اور اختراعی ادبی کام' پر یہ اعزاز دیا گیا ہے۔ 76 سالہ این کارسن کی تحریری دنیا میں شاعری، نثر، مکالمہ، ترجمہ، مضمون نگاری اور کلاسکی یونانی ادب ایک دوسرے سے جڑے نظر آتے ہیں۔ ان کا کام روایتی ادبی اصناف کی واضح حد بندیوں پر قائم نہیں رہتا اور وہ قدیم یونانی اساطیر، فلسفے اور کلاسکی متون کو جدید انسانی تجربات، محبت، غم، خواہش اور تنہائی جیسے موضوعات کے ساتھ جوڑتی ہیں۔ سویڈش اکیڈمی کے مطابق ان کی تحریروں نے عصری ادب کے لیے نئی فنی صورتیں پیدا کی ہیں۔ نوبل کمیٹی نے کارسن کو انعام دیے جانے کی اطلاع اس وقت دی جب وہ آئس لینڈ گئی ہوئی تھیں۔ سویڈش اکیڈمی کی مستقل سکریٹری انگرڈ کارل برگ کے مطابق کارسن فون پر یہ خبر سن کر حیران رہ گئیں۔ انھوں نے بتایا کہ کارسن نے فون پر کہا کہ وہ آئس لینڈ میں ہوا کی آواز سن رہی تھیں۔

این کارسن 1950 میں کنیڈا کے شہر ٹورنٹو میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ٹورنٹو یونیورسٹی سے کلاسکی ادب کا مطالعہ کیا اور بعد میں اسکاٹ لینڈ کی یونیورسٹی آف سینٹ اینڈریوز سے کلاسکی علوم میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ بعد میں وہ امریکا میں مختلف جامعات میں تدریس سے وابستہ رہیں اور کلاسکی یونانی ادب کے ساتھ ساتھ جدید شاعری پر بھی کام کیا۔ یونیورسٹی آف ٹورنٹو نے انھیں اپنی سابق طالبہ قرار دیتے ہوئے نوبل انعام ملنے پر مبارک باد دی ہے۔ کارسن کی معروف کتابوں میں 'آٹو بایوگرافی آف ریڈ' شامل ہے، جو 1998 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب شاعری اور ناول کے درمیان ایک منفرد ادبی شکل اختیار کرتی ہے اور قدیم یونانی شاعر اسٹیسی کورس کی روایت اور افسانوی کردار گیریون کے قصے کو جدید انداز میں پیش کرتی ہے۔ اس تصنیف نے کارسن کو بین الاقوامی ادبی حلقوں میں نمایاں شناخت دلائی ہے۔

ان کی ایک اور نمایاں تخلیق 'دی گلاس ایسّے' ہے، جس میں شاعری، مضمون اور ذاتی تجربے ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب میں ذاتی تعلقات اور جدائی جیسے موضوعات کے ساتھ کلاسکی اور ادبی حوالوں کو جوڑا گیا ہے۔ کارسن کی تحریروں میں ذاتی زندگی اور قدیم ادب کے درمیان یہ امتزاج ان کے مخصوص اسلوب کی اہم خصوصیت سمجھا جاتا ہے۔ 2019 میں ان کی تخلیق 'نورما جین بیکر آف ٹرائے' سامنے آئی، جس میں یونانی اساطیر کی ہیلن اور امریکی اداکارہ مارلن منرو کی زندگیوں اور عوامی تصورات کو ایک ہی ادبی فریم میں رکھا گیا۔ یہ تصنیف کارسن کے اس طریقِ کار کی مثال ہے جس میں وہ قدیم داستانوں کو جدید ثقافتی شخصیات اور سوالات کے ساتھ ملا کر نئے معنی پیدا کرتی ہیں۔

کارسن نے صرف اصل تخلیقی ادب پر کام نہیں کیا بلکہ قدیم یونانی متون کے متعدد تراجم بھی کیے ہیں۔ تاہم ان کے ہاں ترجمہ محض ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی نہیں بلکہ ایک آزاد تخلیقی عمل کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق کلاسکی یونانی ادب کے ان کے تراجم نے ان کی اپنی ادبی تخلیقات پر گہرا اثر ڈالا اور ان کے کام میں قدیم اور جدید کے درمیان مسلسل مکالمہ پیدا کیا۔ این کارسن نے ادب کے علاوہ تھیٹر اور موسیقی کے لیے بھی لکھا ہے۔ ان کے کام میں اوپیرا، پرفارمنس اور اسٹیج کے لیے تیار کیے گئے متن شامل ہیں۔ ان کا ادبی انداز صنف کی روایتی حدود سے ہٹ کر مختلف فنون کو ایک ساتھ لاتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی کتابیں روایتی شاعری یا نثر کی ایک ہی قسم میں رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

نوبل انعام این کارسن کے ادبی سفر کا پہلا بڑا بین الاقوامی اعزاز نہیں ہے۔ انھیں 2020 میں پرنسس آف آسٹوریاس ایوارڈ فار لٹریچر بھی دیا گیا تھا۔ اس اعزاز کے وقت بھی ان کے کام میں قدیم ادب، جدید شاعری اور مختلف ادبی اصناف کے امتزاج کو نمایاں کیا گیا تھا۔ 2026 کا نوبل انعام برائے ادب 12 ملین سویڈش کرونا کی انعامی رقم کے ساتھ دیا جا رہا ہے، جو تقریباً 1.2 ملین امریکی ڈالر کے برابر ہے۔ نوبل تمغہ اور سند 10 دسمبر کو اسٹاک ہوم میں ہونے والی ایک رسمی تقریب میں پیش کیے جائیں گے۔

بچوں کی کشش کا مرکز بنیں رنگ بھرنے والی کتابیں

لکھنؤ (6 اکتوبر)۔ بلرام پور گارڈن میں کتاب میلہ بچوں کے لیے پُرکشش ہندی اور انگریزی تصویری کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ ریختہ کے اسٹال پر بچوں کی نظموں پر مشتمل کتابیں رکھی گئی ہیں۔ ہندی سنستھان کے اسٹال پر پریم چند کی بچوں کی کہانیاں، جیسے منتر، گلی ڈنڈا، پنچ پرمیشور اور آتمارام صرف 15 روپے میں فروخت کی گئی۔ پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ میگزین بال بھارتی سمیت بچوں کے ادب کی ایک وسیع رینج لے کر آیا ہے۔ گیتا پریس کے اسٹال پر بچوں کی متاثر کن کہانیاں، بچوں کے لیے اسباق اور قدیم بچوں کی کہانیاں جیسی کتابیں موجود ہیں۔ جہاں ساہتیہ سروور، رشیکا انٹر پرائزز، پدما بکس اور پیراڈائز بکس سمیت میلے کے تقریباً ہر اسٹال پر بچوں کے ادب کی بہتات ہے، وہیں کئی اسٹال جیسے سستا ساہتیہ منڈل، پربھات اور انکھل پرکاشن نے بچوں کی کتابوں کے لیے حصے مختص کیے ہیں۔ رنگ بھرنے والی کتابیں، پہیلی کی کتابیں اور تحریری مشقیں ہر اسٹال پر دستیاب ہیں۔ لشکیہ سنستھا اور اودھ ساہتیہ اکیڈمی کے کوی سمیلن کے درمیان، اپوروا سنستھان کی شاعری اور اعزازی تقریب اور ممتا پنکج کے ساتھ مل کر ساہتیہ سادھک کی شاعری کی تقریب بھی منعقد ہوئی۔ کتاب 'رانجھا میرا' کی ریلیز کے ساتھ ہی اپوروا کے امروز اور مجاز کو وقف تقریب میں پدم شری ودیا وندسنگھ، آشیما سنگھ، کتھک گرو مورو بھی سنگھ اور کوآرڈینیٹر سنجے مہروترا ہمنوان نے آشیش سنگھ، آرادھنا سیکروار، کمار وکاس اور ممتا کو اعزاز سے نوازا۔

میڈیا فاؤنڈیشن کی جانب سے ڈاکٹر سلطان شاکر ہاشمی کے تعاون سے ان کی کتابیں ہندستانی آئین اور ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کا اجرا بھی عمل آیا۔ اس موقعے پر جسٹس قمر حسین رضوی، مولانا خالد رشید فرنگی محلی، سابق آئی اے ایس چندر پال، سینئر صحافی ہیمنت تیواری، اروند سنگھ بشٹ موجود تھے۔ برجیش کمار مشرا کی کافی ٹیبل بک وِسپر آف دی وائلڈ کا اجرا سابق ڈی جی پی اور ایم پی برج لال، سابق آئی اے ایس رام گیول، سابق آئی ایف ایس افسر آر ایس بھدوریا، سابق آئی اے ایس سنجے کمار اور سینئر فوٹو گرافر انل رسال سنگھ کی موجودگی میں جاری کیا۔
(آگ۔ لکھنؤ)

اردو اسکولوں اور اساتذہ کے ساتھ ناانصافی برداشت نہیں کرسکتے

گڈی بنڈا (30 اگست)۔ اردو ساہتیہ پریشد کے ریاستی صدر محمد ناصر نے کہا کہ ہماری مادری زبان اردو اور اردو اساتذہ کے ساتھ بہت ہی ناانصافی ہورہی ہے۔ پوری ریاستِ کرناٹک میں تقریباً 4500 اردو اسکول ہیں، اردو اساتذہ کی بہت کمی بھی ہے، دوسری زبانوں کے 15000 اساتذہ کے عہدے پُر کیے جارہے ہیں، مگر اس حکومت کو اقتدار پر لانے والوں کو صرف تسلی دی گئی ہے۔ ہم سب مل کر قوم کے بچے اور بچیاں جو اردو زبان سے محبت کرکے اردو زبان کو اپنی مادری زبان سمجھ کر آگے آئے ہیں اُن بچوں کا ساتھ ہمیں دینا ہے۔ منسٹر اور ایم ایل اے اپنی اپنی کرسیاں سنبھالنے میں لگے ہوئے ہیں، اردو کے اساتذہ کی فکر اور ہمارے قوم کے بچوں کی فکر کو لے کر ہم سب اپنا فرض سمجھتے ہوئے آگے بڑھیں تو بہت بڑا فائدہ ہوگا۔ کرناٹک حکومت کے وزیرِ تعلیم مدھو بنگارا نے پی یو سی کالجوں میں اردو زبان کو ختم کردیا ہے۔ سیلف اسٹڈی کو بھی بند کردیا ہے۔ تین سال سے بہت سے بچے اور بچیاں پی یو سی کالجوں میں اردو نہ ہونے کی وجہ سے گھروں میں بیٹھے ہیں، اس بار بھی اردو زبان کے ساتھ ایسا سلوک ہوا ہے، ایک ایک کرکے اردو زبان کو ختم کرنے کی کوشش بھی ہورہی ہے۔ اردو زبان کے اسکولوں کے حالات دیکھیں، اساتذہ کی کمی، عمارتوں کی کمی اور تھوڑے اسکولوں میں تعلیم کی کمی اور بنیادی سہولتوں کا فقدان؛ ان سب کی ذمے داری یہی سرکار ہے۔ اردو زبان کے جلسوں میں بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور بچوں کو انگریزی زبان میں پڑھاتے ہیں، اگر ہم مسلمان ابھی نہیں اٹھیں گے تو آنے والی نسلوں کو کیا جواب دیں گے۔ جب ہماری قوم کی زبان، ہماری مادری زبان کے اسکولوں اور کالجوں اور اردو اساتذہ کے ساتھ ناانصافی ہورہی تھی، ہم چپ چاپ کھڑے ہوکر تماشا دیکھتے رہ گئے۔
(سالار۔ بنگلور)

اُردو زبان کے دیرینہ حل طلب مسائل کے حل کے لیے فیصلہ کُن تحریک کی اشد ضرورت

حیدرآباد (7 اکتوبر)۔ اردو زبان کے دیرینہ حل طلب مسائل کے حل کے لیے فیصلہ کن تحریک وطویل جدوجہد کی اشد ضرورت ہے۔ گذشتہ پندرہ برسوں سے اردو زبان کے مسائل کو برف دان کی نذر کردیا گیا ہے۔ کئی برسوں سے اردو میڈیم ٹیچرس کی اسامیوں پر تقرر نہیں کیا گیا۔ ہر برس وماہ ٹیچرس ولکچررس کے سبکدوش ہونے کے بعد اسامیاں خالی ہورہی ہیں لیکن انھیں پُر نہیں کیا جارہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ اتنی قدیم و عظیم اردو یونیورسٹی میں اردو کا ایک بھی پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر و اسسٹنٹ پروفیسر کا عہدہ مستقل نہیں ہے۔ جز وقتی لکچررس وٹیچرس کا کام لیا جارہا ہے۔ ان مجموعی خیالات کا اظہار ڈاکٹر انیس احمد صدیقی (صدر مسلم تھنک ٹینک ایسوسی ایشن تلنگانہ چیپٹر)، محترمہ عظمیٰ شاکر (رکن خواتین کمیشن تلنگانہ)، جناب عارف الدین احمد (صدر تنظیم تحفظِ اردو تلنگانہ)، مجاہد اردو جناب ایس. کے. افضل الدین (سابق نائب صدر اے پی اردو اکیڈمی)، ڈاکٹر حمیرہ تسنیم (صدر شعبۂ اردو شاتاواہنا یونیورسٹی، کریم نگر)، ڈاکٹر عائشہ بیگم (صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج، سنگاریڈی)، ڈاکٹر عرشیہ جبیں صدیقی (ڈائرکٹر ایمس اکیڈمی حیدرآباد)، ڈاکٹر نجمہ سلطانہ (اسسٹنٹ پروفیسر غلام احمد کالج آف ایجوکیشن)، ڈاکٹر محمد ناظم علی (سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ منڈل، نظام آباد)، جناب محمد عثمان (لکچرر گورنمنٹ جونیر کالج، میدک) نے تنظیم تحفظِ اُردو تلنگانہ کے زیرِ اہتمام منگل و چہارشنبہ 29 اور 30 ستمبر کو بالترتیب پرکاشم ہال گاندھی بھون نامپلی اور اردو گھر مغل پورہ میں منعقدہ دوروزہ تیسویں ریاستی اردو کانفرنس کے موقعے پر کیا۔ بعد ازاں اسی جگہ چہارشنبہ 30 ستمبر کو اردو گھر مغل پورہ میں سنجیدہ و مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ طنز و مزاح کے ممتاز شاعر جناب فرید سحر نے صدارت اور جناب شکیل حیدر نے نظامت کی۔ جناب شاہ نواز ہاشمی، جناب وسیم رومانی (عادل آباد)، جناب بابر شیخ (محبوب نگر)، جناب لطیف الدین لطیف، جناب میر مقبول علی مقبول، جناب نجیب احمد نجیب نے اپنا کلام سنا کر داد حاصل کی۔ جناب شیخ سعید احمد نائب صدر تنظیم کے شکریے پر دوروزہ اردو کانفرنس ومشاعرے کا اختتام عمل میں آیا۔
(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

اُردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام جلسۂ تقسیمِ انعاماتِ کتب کا انعقاد

23 کتابوں کو انعامات سے نوازا گیا، غزل اور صوفیانہ موسیقی کی محفل نے سامعین کو محظوظ کیا

نئی دہلی (10 اکتوبر)۔ اردو اکادمی دہلی، محکمۂ فن، ثقافت والسنہ حکومتِ دہلی کے زیرِ اہتمام 9 اکتوبر 2026 بروز جمعہ سی پی او بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی میں جلسۂ تقسیمِ انعامات کتب منعقد ہوا۔ اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز غزل کی ایک خوب صورت محفل سے ہوا، جس میں پٹیالہ گھرانے کے معروف غزل گلوکار پنڈت دھنجے کول نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے غزل اور صوفیانہ کلام کے ذریعے سامعین کو محظوظ کیا۔

ڈاکٹر شمس اقبال نے اپنے خطاب میں اردو اکادمی، دہلی کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ اکادمی نے انھیں اس تقریب میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا۔ انھوں نے اردو اکادمی، دہلی کو پورے ہندستان کی سب سے زیادہ سرگرم اور متحرک اکادمیوں میں سے ایک قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ گذشتہ 36 برس سے دہلی میں مقیم ہیں اور اس عرصے میں انھوں نے اکادمی کی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گورننگ کونسل موجود ہو یا نہ ہو اردو اکادمی کا عملہ اردو زبان سے جنون کی حد تک محبت کرتا ہے اور اسی محبت کے جذبے کے تحت یہاں مسلسل ادبی وثقافتی پروگرام منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

اردو اکادمی، دہلی کے سکریٹری جناب لیکھ راج نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ حکومتِ دہلی کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ فنکاروں، ادیبوں، شاعروں اور دیگر تخلیق کاروں کو ایسے پلیٹ فارم فراہم کیے جائیں جہاں وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرسکیں، اپنی صلاحیتوں کو مزید نکھار سکیں اور اپنی تخلیقات کو وسیع تر حلقے تک پہنچا سکیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومتِ دہلی کے محکمۂ فن، ثقافت والسنہ کے تحت اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کی اکادمیوں کو بھی فروغ دینے اور ان کی سرگرمیوں کو وسعت دینے کے لیے مسلسل کوششیں کی جارہی ہیں۔

انعامات کے طریقِ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اول زمرے میں منتخب کتاب کے لیے پندرہ ہزار روپے، دوم زمرے کے لیے دس ہزار روپے اور سوم زمرے کے لیے پانچ ہزار روپے کا انعام مقرر ہے۔ اس سال انعامات کے لیے مجموعی طور پر 23 کتابوں کا انتخاب کیا گیا جن میں گیارہ کتابیں اول، چھے کتابیں دوم اور چھے کتابیں سوم زمرے میں شامل ہیں۔

تقریب میں جن مصنّفین کو ان کی منتخب کتابوں پر نقد انعامات، اکادمی کا نشان اور سرٹیفکیٹ تقسیم کیے گئے ان میں 2023 کی کتابوں میں 'اقبال، شاعر شعلہ نوا' (پروفیسر شمیم احمد)، 'کانسے کا سورج سونے کا چاند' (جناب نسیم نقوی) اور 'مولانا ابوالکلام آزاد: مدبر، مفکر اور معلم' (ڈاکٹر واثق الخیر) شامل ہیں جب کہ 2024 کی کتابوں میں 'اقبال جہاں دوست' (پروفیسر عبدالحق)، 'اردو شاعری کی تنقید' (پروفیسر ابوبکر عباد)، 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ان کے بانیان کا سیکولر کردار' (جناب خواجہ عبدالمنتقم)، 'اردو صحافت کے روشن نقوش' (ڈاکٹر منور حسن کمال)، 'مناظر رقص کرتے ہیں' (جناب ناصر عزیز)، 'خطاطی کی مختصر تاریخ' (جناب محمد ذکیرالدین ذکی)، 'اردو صحافت اور ادب: اداریے اور شذرات' (جناب حسن ضیا)، 'آشفتہ سری' (جناب رضوان لطیف خاں)، 'اردو تنقید: نقوش ونشانات' (ڈاکٹر عبدالباری قاسمی)، 'امورِ طبیعیہ پریکٹیکل' (پروفیسر اشہر قدیر)، 'پیش نامے' (ڈاکٹر واحد نظیر)، 'سنگ میل' (جناب ارشد ندیم)، 'مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی: شخصیت اور تحریک کا علمی وتاریخی مطالعہ' (جناب شاہ عمران حسن)، 'زندان' (محترمہ پروین شغف)، 'قلم کی رعنائیاں' (جناب حامد علی اختر)، 'بکھرے ہوئے پھول' (جناب عبدالسلام صدیقی)، 'آسان پہیلیاں' (جناب حبیب سیفی)، 'خدا کے گھر کا بٹوارہ' (جناب تاج الدین محمد)، 'اُڑتی ہے میری خاک' (جناب جاوید احمد صدیقی) اور 'کہکشاں' (جناب نورالعین قیصر قاسمی) شامل رہیں۔
(سیاسی تقدیر۔ دہلی)

◆◆◆

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : سیّد کام کرتا ہے
مرتب : ڈاکٹر عبدالحئی
اشاعت : اگست 2026 (نظرِ ثانی شدہ اڈیشن)
ضخامت : 224 صفحات
قیمت : 500 روپے
ملنے کا پتا : اَرسم پبلی کیشنز، 2878 فرسٹ فلور، گلی کیپٹن والی، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی 110002
تبصرہ نگار : ڈاکٹر عبداللہ عزیز
موبائل نمبر: 9794205642

کتاب کے مطالعے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مرتب کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے تاکہ کتاب کے پس منظر اور اس کی ترتیب و تدوین کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ 'سیّد کام کرتا ہے' کے مرتب نوجوان صحافی، ادیب اور معلم ڈاکٹر عبدالحئی ہیں، جن کا شمار معاصر اردو صحافت، تحقیق اور تنقید کے نمایاں اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی میں آل انڈیا ریڈیو، ای ٹی وی اردو، دوردرشن نیوز، پریس انفارمیشن بیورو اور وزارتِ اطلاعات ونشریات کے الیکٹرانک میڈیا مانیٹرنگ سینٹر جیسے قومی اداروں میں خدمات انجام دیں۔ تقریباً نو برس تک قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی سے وابستہ رہے، جہاں کونسل کے رسائل کی ادارت کے علاوہ شعبۂ تعلقاتِ عامہ (پی آر او) کی ذمے داریاں بھی انجام دیں۔ بعدازاں تدریس سے وابستہ ہوئے، وہ اس وقت صدرِ شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا کے منصب پر فائز ہیں۔ اردو صحافت، ادبی تنقید اور تحقیق ان کی علمی دلچسپیوں کے اہم میدان ہیں۔ ان کی متعدد تصانیف اور مرتبہ کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جن میں 'اردو صحافت اور سرسیّد احمد خاں'، 'ادبی صحافت: آزادی کے بعد'، 'افکار کی خوشبو'، 'سمندر اوپر جھاگ اندر موتی' (مرتبہ)، 'زبیر رضوی: شخصیت اور خدمات' (مرتبہ) اور زیرِ مطالعہ کتاب 'سیّد کام کرتا ہے' (مرتبہ) شامل ہیں۔ ان کی تصانیف کو اتر پردیش، بہار اور دہلی اردو اکادمیوں کی جانب سے اعزازات وانعامات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

'سیّد کام کرتا ہے' طبِ یونانی اور اردو زبان کی فعال اور باعمل شخصیت، حکیم سیّد احمد خان پر ملک کے معتبر اہلِ قلم کے مضامین پر مشتمل ہے، جنھوں نے خدمت اور عمل کو اپنی زندگی کا شعار بنایا اور وہ علمی، طبی، ادبی اور تنظیمی میدانوں میں مسلسل جدوجہد کے ذریعے اپنی ایک نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔ کتاب کا عنوان 'سیّد کام کرتا ہے' اپنے اندر ایک خاص معنوی وسعت رکھتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کے معروف شعر کے مصرعے: 'ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سیّد کام کرتا ہے' اپنے تاریخی پس منظر میں سرسیّد احمد خاں کی عملی جدوجہد کا اعتراف تھا، لیکن مرتب نے اسی مصرعے کو حکیم سیّد احمد خان کی شخصیت کے لیے عنوان بنا کر ان کی عملی زندگی کے ایک نمایاں وصف کو پیش کیا ہے۔ حکیم سیّد احمد خان کی علمی، طبی، ادبی اور تنظیمی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے یہ عنوان محض ایک شعری اقتباس نہیں رہ گیا، بلکہ ان کی عملی زندگی، جہدِ مسلسل اور جذبۂ خدمت کا بھرپور ترجمان نظر آتا ہے۔

انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن (سی سی آر یو ایم) سے کیا اور ہندستان کے مختلف شہروں میں خدمات انجام دینے کے بعد دہلی کو مستقل مسکن بنایا۔ ایک عرصے تک ابوالفضل انکلیو میں محکمۂ آیوش کے یونانی دواخانے میں خدمات انجام دیں، جہاں سے ان کا تبادلہ میرٹھ ہوا اور بعدازاں دوبارہ دہلی کے رام منوہر لوہیا اسپتال سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد صفدر جنگ اسپتال کے یونانی شعبے کے انچارج کی حیثیت سے رٹائر ہوئے۔ ان کی مسلسل عملی سرگرمیوں کے پیشِ نظر پروفیسر اختر الواسع کا یہ قول بالکل برمحل معلوم ہوتا ہے:

> ''اگر آپ کو طبِ یونانی کا ماہر، اس کا معلم، منتظم، جو رٹائر ہو کر بھی اپنے کو رٹائر نہیں ہونے دیتا، بلکہ رٹائر ہونے کے بعد اور زیادہ سرگرمِ عمل کا پیکر بن جاتا ہے، دیکھنا ہو تو ڈاکٹر حکیم سیّد احمد خان کو دیکھیے۔''

اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے حکیم فخر عالم اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں:

> ''کسی فرد کی سبک دوشی کے بارے میں سن کر عام طور پر ذہنوں میں ازکار رفتگی کا تصور آتا ہے، شاید یہ درست ہو، لیکن ایک خاص طبقے کے لیے ملازمت کی تکمیل زندگی کے ایک نئے مرحلے کا آغاز ہے، یہ بھی سچ ہے کہ ایسے لوگ استثنا کے زمرے میں آتے ہیں، حکیم سیّد احمد خان کا شمار بھی مستثنیات میں ہے۔''

حکیم سیّد احمد خان کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف طبِ یونانی اور اردو زبان، دونوں سے گہری وابستگی ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ طبِ یونانی اور اردو کے درمیان ایک تاریخی، علمی و لسانی رشتہ رہا ہے۔ طبِ یونانی کا وسیع علمی سرمایہ عربی و فارسی کے ذریعے برِّصغیر میں پہنچا اور بعدازاں اردو زبان میں منتقل ہوا۔ خود حکیم سیّد احمد خان چوں کہ طب کے طالب علم رہے ہیں، اس لیے ان کی طبی تعلیم اور پیشہ ورانہ وابستگی نے اس علمی و لسانی رشتے سے ان کے تعلق کو مزید تقویت بخشی اور ان کے اندر طبِ یونانی اور اردو، دونوں کے لیے ایک فطری لگاؤ اور انسیت پیدا ہوئی۔ یہی لگاؤ اور تعلق قلبی ان کی عملی سرگرمیوں میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ ایک طرف آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے پلیٹ فارم سے طبِ یونانی کے تحفظ، فروغ اور استحکام کے لیے سرگرمِ عمل ہیں، تو دوسری طرف اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے صدر کی حیثیت سے اردو زبان کے فروغ کے لیے مختلف سرگرمیوں کی قیادت کرتے ہیں۔

اردو کے فروغ کے حوالے سے حکیم سیّد احمد خان کی خدمات کا ایک منفرد اور نمایاں پہلو علامہ اقبال کے یومِ پیدائش، 9 نومبر، کو 'عالمی اردو ڈے' کے طور پر منانے کی روایت کا آغاز ہے۔ اسی بنا پر انھیں عالمی یومِ اردو کے بانی کی حیثیت سے یاد کرنا بالکل بجا معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالحق بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آج ہر قریہ وقصبات میں اردو ڈے جو علامہ اقبال ڈے کے طور پر ہماری زندگی کا ایک علامتی نشان بن گیا ہے۔ اس نشان کے علم بردار حکیم سیّد احمد ہی ہیں۔ اردو کے تعلق سے ان کا نام اس خاص نسبت سے تاریخ کا ایک جزو قرار پا چکا ہے۔''

اسی طرح عالمی یومِ یونانی میڈیسن کو حکیم اجمل خان کے یومِ پیدائش سے منسوب کرنے کی کوششوں میں بھی حکیم سیّد احمد خان کا نام نمایاں طور پر شامل ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں طبِ یونانی سے وابستہ دیگر شخصیات نے بھی کوششیں کیں، تاہم حکیم سیّد احمد خان اور ان کی تنظیم آل انڈیا یونانی طبی کانگریس نے بھی اس مطالبے کو مؤثر انداز میں پیش کیا کہ حکیم اجمل خان کے یومِ پیدائش کو یونانی ڈے کے طور پر منانے کا باقاعدہ اعلان کیا جائے۔ مختلف آرا اور تجاویز کے بعد بالآخر وزارتِ آیوش نے 11 فروری کو حکیم اجمل خان کے یومِ پیدائش کی مناسبت سے یونانی ڈے کے طور پر منانے کا اعلان کیا ہے۔

چناں چہ زیرِ مطالعہ کتاب 'سیّد کام کرتا ہے' کو محض کسی شخصیت پر مرتب کیا گیا مجموعۂ مضامین نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ ایک ایسے معاصر فرد کی علمی و عملی زندگی کا دستاویزی بیانیہ ہے، جس نے طبِ یونانی اور اردو زبان، دونوں کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ان کے فروغ وارتقا کے لیے اپنے شب و روز وقف کر دیے۔

کتاب عمدہ مجلد، دیدہ زیب طباعت اور خوب صورت سرورق کے ساتھ شائع ہوئی ہے، جس پر حکیم سیّد احمد خان کی باوقار تصویر نمایاں ہے، جب کہ پشتِ سرورق پر پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر اختر الواسع کے مضامین سے منتخب اقتباسات درج ہیں۔ کتاب کا انتساب 'محبانِ اردو کے نام' ہے، جب کہ پیش لفظ خود مرتب ڈاکٹر عبدالحئی کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ مرتب نے پیش لفظ میں حکیم سیّد احمد خان کی حیات، شخصیت اور ہمہ جہت خدمات کا جامع خاکہ پیش کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے:

> ''یہ کتاب 'سیّد کام کرتا ہے' دراصل اس شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا آئینہ ہے۔ اس میں شامل مقالات اور تاثرات صرف ان کی خدمات کا تذکرہ نہیں بلکہ اردو زبان کی بقا کی جدوجہد کا ایک مستند ریکارڈ ہیں۔ یہاں قاری پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ کس طرح ایک فردِ واحد اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کے باوجود زبان وادب کے لیے ایک تحریک بن سکتا ہے۔''

پیش لفظ کے بعد 'تیرے بیمار کی بھی کچھ دوا ہے' کے عنوان سے حقانی القاسمی کا ایک فکر انگیز مضمون شامل ہے، جس میں انھوں نے حکیم سیّد احمد خان سے اپنی دیرینہ وابستگی اور ان کی ہمہ جہت شخصیت، علمی و ادبی خدمات اور ملی وسماجی کردار کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ حکیم سیّد احمد خان کی غیر معمولی عملی زندگی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''طب ان کی شناخت ضرور ہے مگر اس کے علاوہ بھی ان کے جنون نے ان سے وہ بہت سارے کام لیے ہیں جو جامعات کے پروفیسروں اور اساتذہ کے کرنے کے ہیں۔''

حقانی القاسمی کی یہ رائے حکیم سیّد احمد خان کی اس ہمہ جہت شخصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں طب کے ساتھ زبان وادب، سماجی خدمت اور تنظیمی سرگرمیاں بھی شامل ہیں۔

پہلا باب حکیم سیّد احمد خان کے 'شخصی وفکری نقوش' کے عنوان سے ہے، جس میں کل چھبیس مضامین شامل ہیں۔ ان میں پروفیسر اختر الواسع کا 'ایک شخصی تاثر'، پروفیسر عبدالحق کا 'حکیم سیّد احمد'، معصوم مرادآبادی کا 'حکیم سیّد احمد اردو کے یونانی مجاہد'، پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا 'جہاں دیدہ ودلنواز شخصیت'، حکیم فخر عالم کا 'ایک مردِ قلندر: حکیم سیّد احمد خان'، حکیم وسیم احمد اعظمی کا 'ڈاکٹر سیّد احمد خان: وحدت میں کثرت'، حکیم رشاد الاسلام کا 'ڈاکٹر سیّد احمد خان: ایک جادوگر شخصیت'، ڈاکٹر لال بہادر کا 'ملازمت کے ساتھ عوامی خدمت کا جذبہ'، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی کا 'سیّد احمد خان: ایک ادبی شخصیت'، ڈاکٹر فیاض احمد کا 'دلی کا درویش'، ڈاکٹر منور حسن کمال کا 'اخوت ومودت کی مورت: ڈاکٹر سیّد احمد خان'، حکیم نازش احتشام اعظمی کا 'ایک پیکرِ عمل: حکیم سیّد احمد خان'، وفا اعظمی کا 'ڈاکٹر سیّد احمد خان ایک تاریخ ساز شخصیت' اور انصاری اطہر حسین کا 'اردو ادب وطب کا روشن ستارہ: ڈاکٹر سیّد احمد خان' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مضامین اپنے شخصی مشاہدات، تاثرات اور تجزیات کے ذریعے حکیم سیّد احمد خان کی ایک ہمہ جہت اور متحرک شخصیت کا ایسا خاکہ پیش کرتے ہیں، جس میں ان کے فکری رجحانات، علمی وابستگیوں اور عملی جدوجہد کے مختلف پہلو یکجا ہو جاتے ہیں۔

دوسرا باب 'سیّد احمد خان اور عالمی یوم اردو' کے عنوان سے ہے، جس میں سہیل انجم کے دو مضامین 'اردو ڈے: سلور جوبلی سے آگے کا سفر' اور دوسرا 'ڈاکٹر سیّد احمد خان: یومِ عالمی اردو کے بانی'، ڈاکٹر شفیع ایوب کا

'تقریباتِ یومِ اردو اور ڈاکٹر حکیم سیّد احمد خان' اور محمد عارف انصاری کا 'یومِ اردو کے بانی: حکیم سیّد احمد خان' شامل ہیں۔ ان مضامین میں عالمی یومِ اردو کے قیام، اس کے اغراض و مقاصد اور اردو زبان کے فروغ کے لیے حکیم سیّد احمد خان کی مسلسل جدو جہد کو مختلف زاویوں سے اجاگر کیا گیا ہے۔

تیسرا باب 'روبرو/ مکالمہ' کے عنوان سے دو اہم انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک 'سیّد احمد خان سے ایک انٹرویو' کے عنوان سے مرتبِ کتاب ڈاکٹر عبدالحئی نے لیا ہے، جب کہ دوسرا 'حکیم سیّد احمد خان سے مکالمہ' کے عنوان سے سلمان کبیر نگری نے کیا ہے۔ یہ دونوں مکالمے کتاب میں اس اعتبار سے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں حکیم سیّد احمد خان اپنی شخصیت، فکر، ترجیحات، علمی و طبی وابستگیوں اور عملی جدو جہد کے بارے میں براہِ راست اظہارِ خیال کرتے نظر آتے ہیں۔

چوتھا باب 'منظوم خراجِ عقیدت' کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے، جس میں متین امروہی، حبیب سیفی، عبدالغفار دانش، محمد مستمر، عرفان آصف، قمرالدین ذاکر، زخمی اورنگ آبادی، عالیہ سیفی، وفا اعظمی، ساحر داؤدنگری اور اعجاز داؤدنگری کے منظوم کلام شامل ہیں۔ اس باب میں مختلف شعرا نے حکیم سیّد احمد خان کی علمی، طبی، ادبی اور تنظیمی خدمات، فعال مزاج اور ہمہ جہت شخصیت کو اپنے اپنے شعری اسلوب میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ خصوصاً متین امروہی کے یہ اشعار حکیم سیّد احمد خان کی مسلسل جدو جہد، عملی فعالیت، طب اور اردو زبان و ادب سے گہری وابستگی اور ان کی ہمہ جہت خدمات کو نہایت مؤثر انداز میں اجاگر کرتے ہیں:

نہ یہ آرام کرتا ہے، نہ یہ بسرام کرتا ہے
زمانے بھر میں اردو کا یہ روشن نام کرتا ہے
سبھی کہتے ہیں ارباب ادب سیّد کے بارے میں
'ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سیّد کام کرتا ہے'

آخری باب 'یادوں کے البم سے (تصاویر)' کے عنوان سے نو صفحات پر مشتمل ایک خوب صورت تصویری البم ہے، جس میں حکیم سیّد احمد خان کی زندگی اور علمی، ادبی، طبی اور سماجی سرگرمیوں سے متعلق مختلف مواقع کی رنگین تصاویر شامل کی گئی ہیں۔

ان تمام ابواب اور متنوع مواد کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ 'سیّد کام کرتا ہے' کی معنویت اس کے موضوع، مواد کے تنوع اور ترتیب و تدوین کے حسن میں مضمر ہے۔ شخصی تاثرات، تحقیقی و تجزیاتی مضامین، مکالمے، منظوم کلام اور تصویری دستاویزات کے ذریعے حکیم سیّد احمد خان کی طبی، علمی، ادبی، سماجی اور تنظیمی خدمات کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ طبِ یونانی اور اردو زبان سے ان کا گہرا تعلق، علمی و ادبی سرگرمیوں میں ان کی شرکت اور تنظیمی سطح پر ان کی فعال کاوشیں کتاب کے مندرجات کو وسیع تر علمی و تہذیبی تناظر عطا کرتی ہیں۔ اردو میں معاصر طبی تذکرہ نگاری کے حوالے سے بھی یہ کتاب قابلِ قدر اضافہ ہے، کیوں کہ اس میں ایک طبی شخصیت کے حالات و خدمات کے ساتھ اس کے فکری، ادبی اور سماجی پہلوؤں کو بھی محفوظ کیا گیا ہے۔

پروف ریڈنگ کی خامیوں سے قطعِ نظر یہ کتاب اردو کی معاصر طبی تذکرہ نگاری اور شخصیت نگاری میں ایک قابلِ قدر اور یادگار اضافہ ہے۔

شبلی کی تحریکی حسّیت اور اس کے اسباب و محرکات

(بقیہ صفحہ 2 سے آگے)

اصلاحی مرحوم سابق ناظم دارالمصنّفین نے لکھا:

''نام وران اسلام کے سلسلے میں جو فرماں روایانِ اسلام علامہ مرحوم کے پیشِ نظر تھے اُن پر براہِ راست نہ سہی، لیکن تاریخِ اسلام اور تاریخِ دولتِ عثمانیہ پر دارالمصنّفین میں جو کام ہوا ہے، اُس سے اس کی کسی حد تک تلافی ہوئی ہے، خود ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں اکثر فرماں رواؤں کے عہد میں جو مشاہیرِ علم گزرے ہیں، اُن پر دارالمصنّفین کا کام وقیع ہے۔ علومِ اسلامیہ کی تاریخ و تدوین اور ہر ہر فن کے اکابر و مشاہیر کے سوانح قلم بند کرنا بھی علامہ مرحوم کے منصوبے میں شامل تھا، اس سلسلے کی کئی کتابوں کا مقالہ نگار نے ذکر کیا ہے، مگر بعض ناموں کا ذکر رہ گیا ہے جیسے سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، سیرتِ عائشہؓ اور اگر اس دائرے کو وسیع کریں تو حیات شبلی اور حیات سلیمان کو بھی اس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

علم کلام اور جدید فلسفے کے علاوہ اصل اسلامی علوم تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے مشاہیر کے حالات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ تاہم اب بھی بہت سارے کام تشنۂ تکمیل ہیں جن کی طرف بجا طور سے مقالہ نگار نے توجہ دلائی ہے جو کرنے کے کام رہ گئے ہیں، اس میں وسائل کی کمی ہی نہیں، افراد کی کمی بھی مانع بنی ہے۔ مقالہ نگار نے خود علمی بدمذاقی کا بار بار ذکر کیا ہے اولاً تو پتہ مار کام کرنے اور جامع کمال اشخاص کا فقدان ہے اور جو ہیں بھی ان کو تن آسانی اور شہرت و نام وری کی طلب اس طرف راغب نہیں ہونے دیتی۔''

(ماہنامہ معارف، فروری ۲۰۰۸ء)

(باقی آئندہ)

دو عظیم شخصیتیں اور کرب ایک: مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

ہی حقیقت کے سامنے لا کھڑا کیا۔ مہاتما گاندھی 30 جنوری 1948 کو قتل ہوئے۔ محمد علی جناح 11 ستمبر 1948 کو وفات پا گئے۔ دونوں کی موت میں صرف چند ماہ کا فرق! ایک ہندستان میں آخری سانس لے گیا، دوسرا پاکستان میں۔ ایک کا آخری باب قاتل کی گولی نے لکھا، دوسرے کی زندگی بیماری، کمزوری اور حکومتی بے توجہی کے سایے میں ختم ہوئی، مگر دونوں اپنے پیچھے ایسی تاریخ چھوڑ گئے جس پر آج بھی برصغیر کے لوگ بحث کرتے ہیں، اختلاف کرتے ہیں، جذباتی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ایک دوسرے سے لڑنے تک پہنچ جاتے ہیں۔ کتنا عجیب ہے! وہ دونوں تو دنیا سے چلے گئے، مگر ان کے نام آج بھی زندہ ہیں... اور ہم آج بھی ان کے نام پر بحث کرتے ہوئے کبھی کبھی وہی غلطی دہرا دیتے ہیں جس کا خمیازہ ان کی نسل نے بھگتا۔

تاریخ ہمیں آخر کیا سکھاتی ہے؟:

تاریخ ہمیں شاید یہی سکھاتی ہے کہ قومیں صرف سرحدوں سے نہیں بنتیں، انسانوں سے بنتی ہیں۔ نقشے بدلنا آسان ہے، دلوں پر لگی لکیریں مٹانا مشکل۔ ریاستیں قائم کرنا ممکن ہے، مگر بچھڑے خاندان واپس لانا آسان نہیں۔ سیاسی نعرے لگانا آسان ہے، مگر نفرت کے بعد پیدا ہونے والے زخم بھرنا نسلوں کا کام ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح دونوں اپنے اپنے نظریات کے ساتھ تاریخ میں داخل ہوئے۔ دونوں نے اپنی اپنی منزل کے لیے جدو جہد کی، مگر دونوں کی زندگی کا اختتام ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ بڑے سے بڑا سیاسی خواب بھی انسانی زندگی سے بڑا نہیں ہوسکتا۔

آج جب ہم تقسیم کے اتنے برس بعد بھی مذہب، قوم، زبان اور شناخت کے نام پر ایک دوسرے سے الجھتے ہیں تو شاید ہمیں ان دونوں شخصیات کی زندگیوں کے آخری ابواب بھی پڑھنے چاہئیں۔

مہاتما گاندھی کے آخری ایام ہمیں نفرت کے انجام کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ محمد علی جناح کی آخری زندگی ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ایک نئی ریاست کا خواب حاصل کر لینا اور اسے مضبوط، منصفانہ اور پُرامن معاشرہ بنانا دو الگ مرحلے ہیں۔ ان کے آخری سفر میں سرکاری بے حسی ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ ریاستیں صرف نعروں اور اداروں سے نہیں، اپنے محسنوں اور شہریوں کے ساتھ ذمے دارانہ سلوک سے مضبوط ہوتی ہیں، اور دونوں کے خاندانوں کی داستان ہمیں بتاتی ہے کہ عظیم سیاسی ناموں کے پیچھے بھی عام انسانوں کے دل دھڑکتے ہیں، رشتے ہوتے ہیں، اختلافات ہوتے ہیں، خوشیاں ہوتی ہیں اور ایسے دکھ بھی ہوتے ہیں جنہیں تاریخ کی موٹی کتابیں اکثر چند سطروں میں سمیٹ دیتی ہیں۔

دو روحیں تھیں... راستے الگ تھے... نظریات الگ تھے... منزلیں الگ تھیں... مگر انجام دونوں کا افسوس ناک تھا۔ ایک گولی کا نشانہ بنا، دوسرا بیماری اور حکومتی لاپروائی کے سایے میں رخصت ہوا۔ ایک نے تقسیم کا درد دیکھا، دوسرے نے تقسیم کے بعد نئی ریاست کا ابتدائی کرب دیکھا۔ ایک اپنے بیٹے کے ذاتی المیے کا دکھ دل میں لیے دنیا سے گیا، دوسرے نے اپنی اکلوتی بیٹی سے پیدا ہونے والی دوری کا درد سہا، اور دونوں کی اولاد بھی اپنے اپنے انداز میں اس تاریخ کے سایے سے گزری۔

شاید برِصغیر کی تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ سیاسی اختلاف کو دشمنی میں تبدیل کرنا آسان، لیکن اختلاف کے باوجود انسانیت کو زندہ رکھنا بہت مشکل ہے۔ تاریخ کے کردار چلے جاتے ہیں، مگر ان کے فیصلوں کے اثرات نسلوں تک زندہ رہتے ہیں۔ اسی لیے آج بھی سوال صرف یہ نہیں کہ گاندھی صحیح تھے یا جناح؟ سوال یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کی تاریخ سے کیا سیکھا؟ اگر ہم نے کچھ نہیں سیکھا تو پھر تاریخ کے صفحات پر لکھے ہوئے لاکھوں آنسو بے معنی ہیں، اور اگر کچھ سیکھ لیا تو شاید برِصغیر کے ان دو بڑے ناموں کی سب سے بڑی میراث یہی ہوگی کہ اختلاف اپنی جگہ، مگر انسان کو انسان سمجھنا کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

E-mail: alkabir786@gmail.com
Phone: 8208435414

اُردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر
رؤف پاریکھ
قیمت: 300 روپے

رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟
ڈاکٹر شمس بدایونی
قیمت: 300 روپے

غروبِ شہر کا وقت
اُسامہ صدیق
قیمت: 900 روپے

مہتاب قدر: 'تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی'

معصوم مرادآبادی

سعودی عرب کے شہر جدہ میں اردو زبان وادب کا چراغ روشن رکھنے والے معروف شاعر، ادیب اور صحافی مہتاب قدر گذشتہ 25 ستمبر 2026 کو اپنے آبائی وطن حیدرآباد دکن میں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کی خبر اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ کسی کو بھی اس پر یقین نہیں آیا۔ مجھے بھی اگر یہ اندوہ ناک خبر خود ان کے اپنے وہاٹس ایپ گروپ 'اردو گلبن' کے توسط سے نہیں ملتی تو اس پر یقین کرنے میں دیر لگتی۔ وہ 'اردو گلبن' کے نام سے نہ صرف ایک نہایت کامیاب ادبی گروپ چلا رہے تھے بلکہ اسی نام سے ایک پندرہ روزہ علمی و ادبی جریدہ بھی شائع کررہے تھے۔ان سے میری پہلی ملاقات 2008 میں جدہ کی عالمی اردو کانفرنس میں ہوئی تھی جس کا اہتمام ہندستانی قونصل خانہ نے اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے تعاون سے کیا تھا اور اس کے روح رواں اس وقت جدہ میں ہندستان کے قونصل جنرل ڈاکٹر اوصاف سعید تھے جو خود ایک ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مہتاب قدر سے پہلی ہی ملاقات اتنی متاثر کن تھی کہ میں ان کی محبتوں کا اسیر ہوتا چلا گیا۔اس کانفرنس میں ہم دونوں نے مقالے پیش کیے۔

مہتاب قدر برسوں سے جدہ میں مقیم تھے اور وہ وہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا جزوِ لاینفک تھے۔ انھوں نے جدہ میں اپنی ادبی سرگرمیوں کا آغاز 'حلقہ ارباب ذوق' سے کیا تھا اور اسی کے تحت جدہ میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا۔جس کا آغاز 1979 سے ہوا۔ وہ جدہ میں مشاعروں اور ادبی نشستوں کے توسط سے ہندو پاک کے ادیبوں اور شاعروں اور صحافیوں میں خاصے مقبول تھے۔مجلس علم وادب جدہ کے روح رواں محمد مجاہد سیّد نے انھیں 'بابائے مشاعرہ' کے خطاب سے نوازا تھا۔

مہتاب قدر کا اصل نام سید سرفراز علی تھا۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدہ میں رہ کر اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے بے لوث خدمات انجام دیں۔ ان کی پیدائش 15 مئی 1957 کو حیدرآباد دکن میں ہوئی تھی۔انھوں نے وہاں کی شہرۂ آفاق عثمانیہ یونیورسٹی سے لائبریری سائنس میں ماسٹر ڈگری حاصل کی

مہتاب نے جدہ میں اپنی ادبی سرگرمیوں کا آغاز 'حلقہ ارباب ذوق' سے کیا تھا اور اسی کے تحت جدہ میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا، جس کا آغاز 1979 سے ہوا۔ وہ جدہ میں مشاعروں اور ادبی نشستوں کے توسط سے ہند و پاک کے ادیبوں اور شاعروں اور صحافیوں میں خاصے مقبول تھے۔ مجلس علم وادب جدہ کے روحِ رواں محمدمجاہد سیّد نے انھیں 'بابائے مشاعرہ' کے خطاب سے نوازا تھا۔

تھی اور اس کے بعد جدہ کی کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی میں بطور لائبریرین تیس سال تک خدمات انجام دیں۔سبکدوشی کے بعد انھوں نے جدہ ہی کو اپنا مستقر بنالیا۔ان کی شعری زندگی کا آغاز چھٹی کلاس میں ہوا جب 1971 میں ان کی پہلی غزل ہفتہ وار 'نشیمن' بنگلور میں شائع ہوئی۔ حیدرآباد کی مختلف ادبی انجمنوں کے زیرِ سایہ ان کا ادبی ذوق پروان چڑھا۔ان کا پہلا شعری مجموعہ 'چھاؤں صحرا کی' 2013 میں منظرِعام پر آیا جس کے انتخاب وترتیب میں مکہ مکرمہ کی علمی وادبی شخصیت نادر خاں سرگروہ نے اہم کردار ادا کیا۔اس مجموعے میں 100 سے زائد غزلیں ہیں۔ایک شعر ملاحظہ ہو:

جس روپ میں تو چاہے ڈھلتا رہوں ہردم
موسم تو نہیں ہوں کہ بدلتا رہوں ہردم

مہتاب قدر کی دوسری کتاب 'تھوڑی سی آوارگی' ہندستان کا سفرنامہ ہے جو 2018 میں بزم صدف انٹرنیشنل نے شائع کی تھی۔ یہ قومی اردو کونسل کی عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کے دوران ان کے ہندستان کے سفر پر مبنی ہے۔ان کی زیرطبع کتابوں میں 'مہتابیاں' (طنز و مزاح) 'نظریات مہتاب قدر' (مضامین) 'شخصیات جن سے ہم ملے' (خاکے)، 'شذرات' (قطعات) اور 'ہمارے نغمے' (نظمیں) شامل ہیں۔انھوں نے عربی وفارسی سے شعری ترجمے بھی کیے۔مہتاب قدر نہ صرف خود ایک اچھے اور سچے شاعر تھے بلکہ ادبی محفلوں کے روح رواں بھی تھے۔انھوں نے دیار غیر میں معاشی مصروفیات کے باوجود اردو کا چراغ روشن رکھا۔ان کی سب سے بڑی خوبی ہم مزاج لوگوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرنا تھی۔انھوں نے صحافتی خدمات بھی انجام دیں اور ایک عرصے تک انگریزی روزنامہ 'سعودی گزٹ' کے اردو صفحے ہفتہ وار 'آواز' سے منسلک رہے۔انھوں نے 'دیدہ ور' کے ادبی صفحات بھی ترتیب دیے۔

مہتاب قدر بڑی خوبیوں والے انسان تھے۔ان کی سب سے بڑی خوبی ان کے مزاج میں بسی ہوئی تواضع اور انکساری تھی۔ جب بھی جدہ جانا ہوا تو مہتاب قدر مرحوم کا نیاز حاصل کیے بغیر واپس نہیں آیا۔ابھی چند روز پہلے ہی ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی تھی اور وہ حیدرآباد آکر اپنے گھٹنوں کا آپریشن کرانے کی تیاری کررہے تھے۔ وہ کافی دنوں سے گھٹنوں کی تکلیف میں مبتلا تھے اور ان کے لیے چلنا پھرنا آسان نہیں تھے۔ گذشتہ برس عمرے کی ادائیگی کے دوران جب برادرم سراج وہاب کی تحریک پر جدہ میں اردو برادری نے مجھے ایک استقبالیہ میں مدعو کیا تھا تو وہاں دو لوگ ایسے تھے جنھیں دیکھ کر مجھے اپنا پچھلا درد یاد آیا۔ان میں ایک سعودی ریڈیو کی اردو نشریات کے سربراہ برادرم لئیق اللہ خاں تھے اور دوسری شخصیت برادر مکرم مہتاب قدر کی تھی۔ مجھ سے ان کی تکلیف دیکھی نہیں گئی اور انھیں آپریشن کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی اپنے تجربات بھی شیئر کیے۔لئیق اللہ خاں گزشتہ دنوں دہلی میں اپنے دونوں گھٹنوں کا کامیاب آپریشن کرا کے واپس چلے گئے۔ اب اسی کام کو انجام دینے کے لیے مہتاب قدر صاحب حیدرآباد تشریف لائے تھے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ان کے اچانک انتقال کی خبر سے خلیج اور ہندستان میں مقیم تمام اردو والوں کو صدمہ پہنچا ہے اور سبھی نے ان کے اچانک انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ مجھے ان کے اچانک انتقال پر کیفی اعظمی کا یہ شعر یاد آیا

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

Z-103، تاج انکلیو، دہلی-110031
E-mail: masoom.moradabadi@gmail.com

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارہ کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***